محمد امان اللہ خان

اسکالر، پی ایچ ڈی، اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس و ٹیکنالوجی اسلام آباد

ڈاکٹر ناہید قمر

استاد شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس و ٹیکنالوجی اسلام آباد

نظریہ پس نو آبادیت اور اردو ادب کا تنقیدی شعور

Muhammad Aman Ullah Khan
Scholar PhD Urdu, Federal Urdu University of Arts, Science and Technology Islamabad.
Dr. Naheed Qamar
Assistant Professor, Department of Urdu, Federal Urdu University of Arts, Science and Technology Islamabad.

Post-Colonial Theory and Urdu Criticism

Colonialism is strictly referred to those policies and Methods through which a Colonialist gets Power that maintained and extended his control over the colonies or the People of a colony. The Power and Control over the people of Colony may get through diplomacy or military as possible. Colonial System also affects the literature of the Colonialized People that are controlled by the colonialist. The Colonial System may harmful fully or partially for the country or nation which is occupied by the Colonialist, as soon as the Colonialist occupies over a country or nation his first and utmost desire is to control the economic position of Subject Country or nation. This Article presents an analysis of Colonial system and its impact on Urdu Criticism.

Key Words: *Post-Colonial, Industrial Revolution, Imperialism, Colonialism, Imperial Hand Cuffs.*

نو آبادیات و مابعد نو آبادیات / پس نو آبادیات کیا ہے؟

عموماً زمانی حوالہ سے مابعد نو آبادیات یا پس نو آبادیات کا تعین کرتے ہوئے دو آراء سامنے آتی ہیں۔ ایک: مابعد نو آبادیات ۱۹۵۰ء سے شروع ہو کر لمحہ موجود تک موجود ہے کیوں کہ یہی وہ دورانیہ ہے جب اکثر یورپی نو آبادیوں نے یورپی حکومتوں سے آزادی حاصل کی اور تاریخ میں بھی یہی وہ واحد عرصہ شمار کیا جاتا ہے جب دنیا کے بڑے حصہ پر نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوا مگر اس دلیل پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر واقعتاً ہی سامراجی اور نو آبادیاتی

نظام کا اختتام ہی پس نو آبادیات کا آغاز ہے تو پھر ہمیں اس کا نقطہ آغاز ۱۸ اویں صدی کے بالکل آخر میں امریکہ کی آزادی کو تسلیم کرنا ہوگا کیوں کہ اس سے آغاز پاکر بیسویں صدی کے نصف تک جو ریاستیں اپنی آزادی کو حاصل کر سکیں خاص طور پر لاطینی امریکہ کی ریاستیں، افریقی اور ایشیائی ریاستوں کی آزادی میں مکمل آزادی کا عمل پورا ہوتا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ خطہ ارض میں اب بھی کئی ایک ایسے ممالک موجود ہیں جو ابھی بھی جزوی یا مکمل طور پر سامراج کے جال میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں جیسا کہ ہانگ کانگ، کشمیر، افغانستان، شام، برما اور فلسطین کی مثال دی جا سکتی ہے۔یوں مابعد نو آبادیات / پس نو آبادیت کا دائرہ اٹھارویں صدی سے ابتدا کر کے موجودہ عہد کی حکومتوں تک کو اپنے حصار میں لیتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے پس نو آبادیات کے نقطہ آغاز کو تاریخ کے خط استوا پر تلاش کرنا خاصا مشکل امر ہے اور یہ طرزِ فکر اس وقت مزید غالب آجاتا ہے جب کوئی بھی خطہ زمین اپنے سیاسی اور انتظامی امور کے لحاظ سے کے کسی بھی قسم کے سامراجی اور نو آبادیاتی سوچ کے غلبے کا شکار ہو جائے۔ دیکھا جائے تو پس نو آبادیت / مابعد نو آبادیات کی اصطلاح استعماراتی اور سامراجی نظام کے نقطہ آغاز سے لے کر لمحہ موجود تک ان نظاموں سے متاثرہ تمام تہذیبوں اور ثقافتوں اور ان میں تخلیق شدہ ادب کو اپنے دائرہ کار میں لاتی ہے۔ اس لحاظ سے پس نو آبادیات کا تعلق تہذیب و ثقافت، معیشت، سماج، تعلیمی نظام، نفسیات، ادب اور معاشرتی اقدار سے بڑا گہرا ہے۔ استعماراتی اور سامراجی نظام نے اپنی جڑیں سب سے پہلے سامراجی اور استعماراتی دنیا کے قلب (زبان) میں قائم کیں اور ان کو اس حد تک مضبوط کیا کہ تاحال پاکستانی قوم کی زبان اردو کو احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پس نو آبادیاتی مفکرین نو آبادیاتی نظام کے خاتمے یا پس نو آبادیاتی نظام کے نقطہ آغاز کو اس وقت سے آغاز دیتے ہیں جہاں سے ان سامراجی اور استعماراتی قوتوں نے اپنے علاوہ اقوام یعنی مغلوب باشندوں کی تاریخ، تہذیب، معیشت، نفسیات، علم و فکر، فن، ادب اور ثقافت پر پنجے گاڑے اور اپنے اثرات کو ان پر ثبت کرنا شروع کیا۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر ناہید قمر کا یہ بیان قابل غور ہے۔

> "سابقہ نو آبادیوں کے عوام کو لونیل وراثت کا جواب نو آباد کاروں کی زبان میں اپنی تاریخ اور روایات کا اظہار اپنے مقاصد کے تحت لکھ کر دیتے ہیں۔ مقامی رد نو آبادیت مقامی لوگوں پر پس نو آبادیت کے نظریہ کے فکری اثرات کا مظہر ہے اس رویے کے تحت تخلیق کیا گیا سارا ادب پس نو آبادیاتی ہے۔ پس نو آبادیت نو آباد کاروں کے حوالہ سے نو آباد عوام کی مزاحمت اور سامراجی منصوبوں کے خدوخال واضح کرتی ہے، جن

میں اپنے غلبے کا جائز قرار دینے کے لیے ایک سے زائد حکمت عملیوں بشمول غیر مفتوحانہ بیانیے کا استعمال کیا گیا۔" (۱)

پس نو آبادیات تاریخی عمل کو ایک قسم کی معروضیت دیتی ہے اور نو آبادیاتی نظام کے زیر سایہ رہنے والوں کے تجربات کی موضوعیت کے ساتھ ایک تعلق بھی قائم کرتی ہے۔یہی وہ خصوصیت ہے جو اس نظریہ کو دوسرے نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔لہٰذا ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ پس نو آبادیاتی ادب کا دائرہ کار بلاشبہ یہی ہے جو انسانی محرکات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ہم یہ بھی کہ سکتے ہیں کہ نظریہ پس نو آبادیات کا آغاز در اصل اس سیاسی بصیرت کا حصہ ہے اور اس بصیرت کے ضمن میں کیے جانے والے تجربات سے ہوتا ہے جو نو آبادیاتی، ثقافتی، سماجی، معاشی، نفسیاتی، تہذیبی، علمی، فکری و فنی اور تعلیمی غلبے کے خلاف عوامی سوچ کے سبب پیدا ہونے والی مزاحمت کے دوران سامنے آتے ہیں۔پس نو آبادیات مشرقی اور مغربی دنیا کے درمیان تہذیبی و ثقافتی، سیاسی و سماجی، معاشرتی و معاشی، نفسیاتی و علمی، تعلیمی اور فکری و فنی رشتوں کو ایک نئے انداز میں دیکھنے کا نیا طریقہ ہے۔اسی لیے "ژونگ" کو کہنا پڑا کہ پس نو آبادیات اس وقت تک قائم و دائم رہے گی جب تک سماج میں ناانصافی اور احتساب سے ماورا قوت اور غلبہ کے رشتے موجود ہیں لہٰذا پس نو آبادیاتی سوچ کا نظریہ اپنے اس مخصوص دائرہ سے نکل کر کھلی فضاؤں میں اڑتا پھرتا معلوم ہوتا ہے۔اس حساب سے اس نظریہ کا تعلق معاشرے کی اجتماعیت سے ہے۔یہ الگ بات ہے کہ کوئی بھی معاشرہ و سماج نو آبادیاتی یا سامراجی و استعماراتی نظام کے زیرِ اثر رہا ہے یا نہیں۔کسی بھی سماج کا اس استحصالی نظام کے خاتمہ کے لیے اپنی کاوش کرنا اور اس کاوش کے شعور کو بیدار کرنا اور غلبہ کی قوّت کے سرچشمہ کو حدِّ نظر میں رکھتے ہوئے اس کے ایک جانب موجود نظر انداز کیے گئے وجود کو وہ آواز عطا کرنا جو اس کے استحصال کے خلاف مزاحمت ہو، پس نو آبادیت کی ذیل میں آئے گا۔پس نو آبادیت کی اصطلاح کو اگر ایسی وسعت دے دی جائے جس کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ بھی محلّ نظر کرنا ہوگا کہ کیا سابقہ استعماری طاقتوں اور ریاستوں کا اپنے ممالک، سرحدوں اور عوام کا استحصال اور ان پر ظلم و ناانصافی کی کسی بھی قسم کے خلاف مزاحمت کو پس نو آبادیت کا نام دیا جائے گا یا نہیں؟ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پس نو آبادیاتی / مابعد نو آبادیاتی سوچ اور نظریہ کسی بھی قوم کی تہذیب و ثقافت، علم و فن، تعلیمی نظام، سیاست و معیشت، نفسیات وغیرہ کو سامراج اور استعماریت کی خفیہ اور واضح زنجیروں سے رہائی دلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔گویا ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت، علم و عمل، معیشت و سیاست اور فکر و فن کی توسیع کے ساتھ ساتھ سامراجیت، استعماریت اور نو آبادیت سب کی سب ایک سے زیادہ شکلوں میں اپنے امکانات موجود ہیں۔پس

نو آبادیت ایک ایسا فکری نظام ہے جو مسلّمہ اصولوں اور متعین مقداروں سے خود کو قدرے فاصلے پر رکھ کر سوچتا ہے، مزید یہ کہ پس نو آبادیات کا نظریہ، سوچ کا وہ محور ہے جو ظاہر و باطن، عیاں و غیر عیاں، حاضر و غیر حاضر، قدیم اور حادث غرض ہر قسم کی جہات کو ایسے واضح طور پر کھنگالنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں کسی قسم کا کوئی بھی تصادم نہیں ہونے دیتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مابعد نو آبادیاتی بیانیے حقیقت تک رسائی کی ایک کوشش ہیں، شناخت کے مبہم اور ظاہر کرنے کے لیے سامراجی، استعماری اور نو آبادیاتی ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرنے کا نام ہیں۔ یورپی اقوام نے جب سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی، تو ایک ایسے نشے میں ڈوب گئے کہ وہ پوری دنیا کے وسائل کو صرف اپنا حق سمجھ بیٹھے۔ امریکہ، ایشیا اور افریقی عوام کے باشندوں پر اپنا تسلّط قائم کیا۔ جہاں وہ آسانی سے غالب نہ آسکے وہاں تشدّد کا رستہ بھی اپنایا اور کہیں کہیں تو ثقافتی غلبے کے ذریعے زمین کے کافی حصہ پہ غالب آ گئے۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ایک تہائی زمین کے اکیلے مالک تھے۔ ہندوستان میں غلبہ حاصل کرنے کے لیے دونوں طریقے آزمائے گئے جہاں کہیں مزاحمت کا سامنا ہوا وہاں اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے مخالف کو زیر کیا اور اس مقصد کے لیے ہر قسم کی غداری کے لیے عوامی نمائندوں اور خصوصاً مشیروں کو خریدا گیا۔ مزید براں یہاں کے باشندوں کو وحشی، بندر، علم و فن اور تہذیب و ثقافت سے عاری قرار دے کر خود کے علمی، تہذیبی و معاشرتی، سماجی و سیاسی اور اخلاقی بیانیوں کو پروان چڑھانے کی بھرپور سعی کی گئی۔ نو آبادیت دراصل سیاسی، ثقافتی، معاشرتی، معاشی، نفسیاتی، علمی، انفرادی، اور فکری غلبے کا نام ہے جس میں عسکری و افرادی اور نفسیاتی شعور کی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ایسی آرا کو فروغ دیا جاتا ہے جس سے مقامی باشندوں کی تخلیقی ورثہ کو بیک جنبش قلم رد کر دیا جاتا ہے۔ نو آبادکار اس کام کے لیے ریاستی مشینری اور ذرائع مواصلات و ابلاغ کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ نو آبادکار اپنے مقصد کے حصول کے لیے عسکری و سیاسی حربوں کے ساتھ ساتھ اپنی قائم کردہ نو آبادی کے باشندوں کی ذہنی اور نفسیاتی تسخیر کو بھی لازم گردانتا ہے۔ یہ تسخیر اس وقت حاصل ہوتی ہے جب نو آبادکار اپنی تہذیب و ثقافت اور علمی بیانیہ کو برتر اور مقامی باشندوں کے علمی و ثقافتی بیانیہ کو کم تر ثابت کر کے مقامی افراد کو احساسِ کمتری کا شکار کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں اسی طرز پہ عمل کرتے ہوئے نو آبادکاروں نے نفسیاتی غلبہ حاصل کیا اور زبان و ادب اور مشرقی علوم کی واقفیت کو اس برتری کا ذریعہ بنایا۔ نو آبادیاتی نظام میں مشرق و مغرب، جاہل و عالم، غیر مہذب و مہذب، غلام اور آقا کی کشمکش کو جاری کیا جس کا انجام کار آقا کی برتری اور غلاموں کے احساسِ کمتری پر ہوا۔ نو آبادکار نو آبادیاتی نظام کے قیام کے لیے ایک مذہبی جواز یہ بھی پیش کرتا ہے کہ نو آبادیاتی نظام دنیا کو خیر کی طرف بلانے

اور شر سے دور کرنے میں مدد کرتا ہے اور اس طرح مقامی باشندوں پر ہر طرح کے استحصال اور ظلم و ستم کو اپنے حق میں مناسب قرار دیتا ہے۔ ذیل کا بیان اس کی وضاحت کے کافی ہے:

"نو آباد کار خود کو نو آبادیاتی اقوام کے سامنے قدر اور اصول کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پیش کرنے کا طریق کار علمی اور فلسفیانہ ہو سکتا ہے مگر اصل میں یہ اصول طاقت اور اقتدار سے عبارت ہوتا ہے۔ نو آباد کار جب نو آبادیاتی اقوام کے علوم، زبان، ثقافت، تاریخ اور ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو یہ معروضی، غیر جانب دارانہ مطالعہ نہیں ہوتا۔ اس کی نوعیت ڈسکورس، کی ہوتی ہے"۔ (۲)

درج بالا بیان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نو آبادیاتی نظام ایک ایسی صورتِ حال کا نام ہے جس میں نو آباد کار، نو آبادیاتی باشندوں کی ذہنی، سیاسی، معاشرتی، معاشی، ثقافتی، نفسیاتی، علمی و فکری دنیا پر تصرّف کر کے اپنے بیانیے کو تشکیل دیتا ہے۔ جہاں تک نو آبادیات اور پس نو آبادیات کے باہمی تعلّق کا معاملہ ہے تو یہ دونوں اپنے راستے کے اعتبار سے بالکلیہ مخالف چلتے ہیں۔ گویا:

- نو آبادیات میں جو خصوصیات کی پائی جاتی ہیں پس نو آبادیات انہی خصوصیات کا مطالعہ ہے۔
- نو آبادیات جس فکر کا پرچار کرتی ہے پس نو آبادیات اسی سوچ کے پیچھے کار فرما مقاصد کو عیاں کرنے کا نام ہے۔
- نو آبادیاتی نظام میں اضداد اور اختلافات کے سبب مخصوص مزاج قائم کیا جاتا ہے پس نو آبادیاتی نظریہ یا نظام ان اضداد اور اختلافات کی گتھیاں سلجھانے کا نام ہے۔
- نو آبادیاتی نظام سیاست اور طاقت کے باہمی میل جول کی مختلف صورتوں کو نافذ کرنے کا نام ہے جب کہ پس نو آبادیاتی نظریہ سیاست اور قوت اس باہمی ملاپ کو جاننے اور نو آبادیوں کے باشندوں پر اس کے غلبے کے اثرات کا پتا لگانا ہے۔
- نفسیاتی حوالے سے نو آبادیاتی نظام قوت کے مرکزِ واحد ہونے کا پختہ یقین رکھتا ہے جب کہ پس نو آبادیاتی نظام تکثیریت کا قائل ہے۔
- نو آبادیاتی نظام آئیڈیالوجی اور نظریات کا نظام ہے جب کہ پس نو آبادیاتی نظریہ مقامیت، علاقائی اور نسلی گروہ بندی کو اہمیت دیتا ہے۔

- نو آبادیاتی نظام محدود شناخت کا تصوّر دیتا ہے جب پس نو آبادیاتی نظریہ انسانی آزادی کے امکانات کو واضح کرتا ہے۔
- نو آبادیاتی نظام تصنیف و تالیف کے متون پر حاوی ہو جاتا ہے جب کہ پس نو آبادیاتی نظریہ ان متون کے تناظر کو اہمیت دیتا ہے۔
- نو آبادیات کا نظام عقلِ کُل اور حقیقتِ کُل کی بنیاد صرف حسّی اور تجرباتی دنیا کو بیان کرتا ہے جب کہ پس نو آبادیاتی نظریہ و نظام عقلِ کُل اور حقیقتِ کُل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دیگر ذرائع جیسے الہام، وحی، شعور اور لاشعور وغیرہ کو بھی اہمیت دیتا ہے۔
- نو آبادیاتی نظام وہ ہے جس میں غالب ثقافت یعنی مغربی تہذیب و ثقافت کو عوامی سطح پر تسلیم کروایا جاتا ہے جب کہ پس نو آبادیاتی نظریہ مقامی باشندوں کی تہذیب و ثقافت کی قدیم اصل کا کھوج لگا کر غالب بیانیہ کے برعکس مغلوب قوم کے بیانیے کو قائم کرنے کے ساتھ مغربی تہذیب سے منھ موڑ لیتا ہے اور اس کو رد کر دیتا ہے۔
- نو آبادیاتی نظام مشرقی دنیا کو مغربی معیار پر پرکھنے اور مشرق کی جانکاری مغرب کے علوم کے مطابق کرنے اور اس آگاہی کے سبب مغرب کے اعلیٰ وارفع ہونے کے تصور کو قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ پس نو آبادیاتی نظام اس آگاہی اور فکر و فن کی حقیقت کو واضح کرنے کے ساتھ مشرقی دنیا کو اپنے ذاتی و انفرادی تصوّرات کے مطابق نئے نظام کو جانچنے اور پرکھنے کا کام بھی کرتا ہے۔ ذیل کے بیان سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔

> نو آبادیاتی باشندہ، نو آبادکار کے بغاوت بھی کرتا ہے۔ یہ بغاوت براہ راست اور بالواسطہ صورتوں میں ہوتی ہے۔ جب یہ بغاوت اپنی محرومی کے سبب کے تجزیے کے نتیجے میں ہوتی ہے، مقامی، نو آبادکار کو اپنی حالت زار کا سبب سمجھتا اور اس کے خلاف ہوتی ہے، جو نو آبادکار کی ثقافت کے انجذاب کا قائل ہوتا ہے اور خود اس طرح، نو آبادکار کا حلیف بنا کر پیش کرتا ہے۔ نو آبادکار ماڈل ہوتا ہے اور بغاوت کی صورت میں اینٹی تھیس کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔ اصل میں بغاوت، انجذاب کا اینٹی تھیس ہے۔ انجذاب کا اثبات، بغاوت کی نفی میں اور انجذاب کے اثبات میں بدل جاتی ہے۔ بغاوت

میں نو آباد کار کا انکار اور اپنا اثبات کیا جاتا ہے۔اب اسی شدت سے اپنے ماضی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ بغاوت کے نتیجے میں علاقائیت اور قومی ثقافت کے احیا کی تحریکیں چلتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تمام نو آبادیاتی ممالک میں قومی ثقافتوں کی تحریکوں کا آغاز، نو آبادیاتی نظام کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں ہوا ہے۔ (۳)

نظریہ پس نو آبادیات کے حاملین

پس نو آبادیت کے بنیادی نظریہ سازوں جو لوگ شامل ہیں ان میں Edward Said کا نام سرِ فہرست ہے۔اُن کی تصنیف Orientalism جس کا ترجمہ "شرق شناسی" ہے جو ۱۹۷۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔اس کتاب نے نظریہ پس نو آبادیات کی علمی و فکری خصوصیات کو سمجھنے میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ البتہ اس سے پہلے Frantz Fanon کی شہرہ آفاق کتاب جس کا ترجمہ سجاد باقر رضوی نے "افتادگانِ خاک" میں افریقی نو آبادیاتی نظام کے ظلم و ستم کو بے نقاب کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔علاوہ ازیں نو آباد کار اور نو آبادیاتی باشندوں کے مابین موجود طاقت اور تشدّد کے رشتوں کا انکشاف کرنے کے سبب پس نو آبادیات کے نظریہ کی بنیاد بھی رکھ دی تھی ۔اس کے ساتھ ساتھ پس نو آبادیاتی نظریہ کو استحکام حاصل کرنے میں ایڈورڈ سعید کی کتاب "شرق شناسی" کافی اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب میں ایڈورڈ سعید نے اس طریقہ کار اور حکمتِ عملی کی وضاحت کی ہے جو نو آباد کاروں نے اپنی مغربی تہذیب کی برتری کو ثابت کرنے کے لیے مشرق کی تہذیب و ثقافت پر "غیر مہذب" ہونے کی چھاپ لگا کر مشرق کو بالکلیہ "غیر" ہی بنا دیا ہے جس کے سبب مشرق کو مستقل احساسِ کمتری کا شکار کر دیا ہے۔ایڈورڈ سعید نے Orientalism کی ابتدا کو مصر پر نپولین کے قبضہ کو تسلیم کیا ہے جو ۱۷۹۸ء میں کیا گیا ہے۔ مشرق کے متعلق معلومات کے تبادلہ کے لیے عمومیت کے اصول کو اختیار کو اختیار کر کے اپنی علمی کاوشوں کے پس پردہ اس بیانیہ کو بیان کیا ہے جس کے سبب مغرب اپنی تہذیب کو مشرق کے مقابلہ میں برتر سمجھتا ہے۔ایڈورڈ سعید کا کہنا ہے کہ مشرق اور مشرق کے باشندوں کی تعلیمی، معاشی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی سیاسی ، نفسیاتی، اور فکری و فنی جھلک جو مستشرقین کی تحریروں میں نظر آتی ہے دراصل وہ حقیقت سے کوسوں دور ہے ۔ایڈورڈ سعید اس جھلک کو نو آباد کاروں کے سیاسی، نفسیاتی، فکری و فنی، علمی معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، اقتصادی اور فکری و فنی مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے اور اسی کے سبب وہ مستشرقین کے علم کو بھی خالص نہیں مانتا ۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس علم کے پیچھے بھی یورپ کی افادیت پسندی کا تصوّر ہی کار فرما نظر آتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ

نو آباد کار ہمیشہ ایک احساسِ برتری کے ساتھ ہی اپنی محکوم کا علم حاصل کرتا ہے اور اسی زعم میں اپنی حیثیت اور مقام و مرتبہ کو بلند تر رکھنے کے لیے اپنے بیانیے اور نظریہ "شرقی" یعنی مشرق کے رہنے والے اور "غیر" مراد مقامی لوگ، جیسی اصطلاحوں کے سبب اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی مستشرقین اور نو آباد کاروں کی جانب سے حاصل شدہ مشرق کی معلومات اور ان معلومات کے سبب اخذ کردہ علم کو Orientalism کہا گیا ہے اور یہی ایڈورڈ سعید کے مطالعہ کا موضوع ہے اور اسی کو اس نے یورپی علم کے تصوّرِ افادہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اُن سوالات کے جواب دینے کی بھی بھرپور کاوش کی ہے جن کی بنیاد پر مشرقی علم یا مستشرقین کی اصطلاح وجود میں آئی۔ وہ Orientalism کو ایک بیانیہ قرار دیتے ہوئے اسے طاقت اور علم کا گٹھ جوڑ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نو آبادیاتی نظام میں نو آباد کاروں کے متون میں مغلوب اقوام کی تخلیقات کا ذکر بھی نہیں ملتا جب کہ وہ بھی زبان و ادب اور ادبی تخلیقات کو بیان کرنے کے لیے اپنی زبان رکھتے ہیں لیکن ان کی زبان کی یہ آواز نو آباد کاروں کی سماعت تک پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی دقّت نہیں ہونی چاہیے کہ محکوم گونگے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نو آباد کار اپنے محکوم لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے تو وہ اپنے سامنے اپنے ہی معیارات اور مفادات کو رکھتا ہے اور انہی مفادات کے پیش نظر وہ مقامی ثقافت سے نابلد ہونے کے سبب مقامی رسومات کے حسّاس پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتا ہوا آگے گزر جاتا ہے۔ یہ واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حاکم کے بیانیے میں محکوم قوم کی آواز نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم قوم کا بیانیہ محکوم قوم کی آواز سننے کے لیے تشکیل ہی نہیں دیا جاتا۔ نو آبادیاتی نظام میں مقامی لوگوں کے لیے قانون سازی کرتے ہوئے ہمیشہ محکوم قوم کے باشندوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ان کی مذہبی، معاشی و معاشرتی، علمی و فکری حیثیت کو ختم کر دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ محکوم قوم کی مذہبی آزادی کو ختم کر دیا جاتا ہے اور ان مذہبی اقدار اور رسوم پر پابندی لگاتے ہوئے کبھی بھی محکوم قوم کے باشندوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ نو آباد کار صرف تعلیمی اصطلاحات کی ذیل میں ہی نہیں بلکہ قانون سازی کرتے ہوئے بھی ہمیشہ اپنے استعماری مقاصد کو ہی پیش نظر رکھتا ہے۔ یہ نو آبادیاتی نظام کا ہی خاصہ ہے کہ جس میں مغلوب اقوام اور باشندے اپنے آپ کا علم بھی نو آبادیاتی نظام کے قائم کردہ نظریات اور ڈسکورس کے تابع رہ کر ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان بیانیوں کے قائم کرنے میں نو آباد کار اپنی مرضی کے رنگ بھر کر اپنی مرضی کے قانون بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر محکوم دہری محکومیت کا شکار ہو جاتا ہے جیسا کہ ہندوستان کی تاریخ میں ہو گزرا ہے۔

ہومی کے بھابھا پس نو آبادیاتی مفکّر کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ بھی ایڈورڈ سعید کی طرح وسیع درجے پر انسانی جبر کے ایک اور اہم سامراجی عہد کو ہمارے سامنے لانے کے لیے استعماریت کے ظلم و تشدّد اور جبر و بربریت کو بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی یہ کاوش بیسویں صدی کے آخر میں آنے والے کئی ایک محققین کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے حقائق تک پہنچنے کی کاوش ہے۔۔ ہومی کے بھابھا نے اپنے سے قدیم کے محققین اور اپنے دور کے جدید مفکرین و ناقدین کے علم سے مستفید ہوتے ہوئے نہ صرف قدیم بل کہ جدید مباحث کو پیش کیا ہے اور اپنے طور پر ایک نئی فکر اور تھیوری جو نظریہ پس نو آبادیت کو جامع طور پر پیش کرتی نظر آتی ہے۔ ہومی کے بھابھا نے تہذیب و ثقافت کے مطالعہ کو نظریہ پس نو آبادیات کی فکر کے ساتھ ملا کر شعور کو ایک نئے راستے پہ گامزن کر دیا ہے۔ سامراجی اور استعماراتی نظام کا جائزہ کئی ایک اختلافات کو پیش کرتا ہے۔ آقا اور غلام، حاکم و محکوم، مہذب و غیر مہذب، جدید اور روایتی، قدیم اور جدید جیسے تضادات میں کئی ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب شمار کیا گیا ہے۔ یہی وہ تضادات ہیں جو نو آبادکار اور نو آبادی کے باشندوں کے درمیان صاف محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ انہی تضادات کو ہومی کے بھابھا نے نو آبادکاروں کی مشنری سرگرمیوں کو نشان زد کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ دیکھا جائے تو نو آبادکاروں نے ایک لحاظ سے مقامی لوگوں کو مہذب بنانے اور ان کی اصلاح کے لیے عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے کو فرضِ عین قرار دیا ہے تو دوسرے لحاظ سے اس اصلاح کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی میں روشن خیالی اور آزادی حاصل کرنے کے خیال کے خدشے کے سبب گریز کا رویّہ بھی اپنایا ہے۔ نو آبادکار اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر مقامی سطح پر ایسے باشندے تلاش کرتا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو مقامی ہوں اور لیکن سوچ کے اعتبار سے خالصتاً اپنے مالک کے حامی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے نمائندے اپنے آقا کے مطلق نقال تو ہوتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں اپنے مالک کا روپ نہیں دھار سکتے اور نہ ہی اوہ اس قوت کے مالک ہو سکتے ہیں جس کے مالک ان کے آقا یعنی نو آبادکار ہوتے ہیں۔ ایسی کئی ایک مثالیں اردو زبان و ادب میں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہومی کے بھابھا اس نظریہ کے قائل ہیں کہ نو آبادیاتی ڈسکورس مقامی باشندوں میں نو آبادکار کی مشابہت تو پیدا کرتا ہے تا کہ اپنے مالک و آقا کے نظریات کو فروغ دے کر آقا کے مفادات کو پورا کر سکے اور آقا کی خوشنودی بھی حاصل کر سکے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایسی نقل یا مشابہت جو نو آباکار کی ترجمانی کر سکے وہ نو آبادکار کی طاقت کو کمزور کر دیتی ہے۔ اس لیے بھابھا کے مطابق نو آبادیاتی نظام کے مادی اثرات اور اس کے اخلاق و علمی برتری کے ڈسکورس اور بیانیہ کے فرق کو واضح کر دیتے ہیں۔ مزید براں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نو آبادکار کی نقل نو آبادیاتی نظام

میں نہ صرف ایک خلا کو جنم دیتی بل کہ نو آباد کاروں کے مقاصد کی تکمیل کو بھی ممکن بنا دیتی ہے۔ نقل کا یہ دوغلا پن پس نو آبادیاتی فکر میں ہومی کے بھابھا کے سبب ہی متعارف ہوا ہے۔ چوں کہ دوغلا پن اپنے اندر ہر لحاظ سے دو طرح کی خصوصیات رکھتا ہے لہٰذا یہ تہذیبی و ثقافتی نظریات اور رسوم ورواج کو بھی چیلنج کرتا ہے۔ ہومی کے بھابھا کا یہ کہنا ہے کہ نو آبادیاتی نظام کی موجودگی ہمیشہ سے دوغلا پن ہی ہوتی ہے یعنی اس میں دوغلا پن موجود ہوتا ہے۔ یہی وہ دوغلا پن ہے جو استعمار کار اور نو آباد کار کو حقیقی اور غالب ہونے کے اظہار کو تسلسل اور امتیاز میں تقسیم کر دیتا ہے، ہومی کے بھابھا اسی تہذیبی و ثقافتی دوغلے پن کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ تہذیبیں اور ثقافتیں کبھی بھی منجمد نہیں ہو سکتیں بل کہ وہ مستقل بہاؤ بہتی ہیں اور ایک دوسرے کے اثرات کو قبول کرتی یا رد کرتی نظر آتی ہیں۔ اسی تہذیبی و ثقافتی دوغلے پن کے نظریہ کے تہذیبی و ثقافتی فوقیت کا نکار کرتے ہوئے بھابھا نو آباد کار اور نو آبادیاتی نظام کی تہذیبی برتری کے بیانیہ پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بھابھا اس مقام یا حد کا بھی ذکر کرتے ہیں جہاں پر نئے تہذیبی و ثقافتی معنی نمودار ہوتے ہیں اور یہ حد وہاں ہی دیکھی جا سکتی ہے جہاں تہذیبیں اور ثقافتیں ایک دوسرے کے اثر کو قبول کرتی ہیں یا خود سے پرے دور کر دیتی ہیں۔ بھابھا نے نو آبادیاتی نظام کو دو بنیادی تصورات پر تسلیم کیا ہے۔ ایک تو تصورِ جمود اور دوسرا تصورِ ثنویت۔ جمود بایں معنی کہ ثقافتی رشتوں میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں جب کہ دوسرے تصور ثنویت میں بھی ایک غالب اور دوسرا مغلوب ہے۔ یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ سامراجی و استعماراتی نظام کے ختم ہو جانے کے باوجود بھی ابھی تک مشرق کے باسیوں کو "غیر" جیسی اصطلاح کے ضمن میں یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک نو آبادیاتی نظام کا خفیہ جال کام کر رہا ہے اور نو آبادیاتی نظام کا نفسیاتی خاتمہ ممکن نہ ہوا ہے۔ یہ کہا جا سکتا کہ سامراجی / استعماراتی یا نو آبادیاتی دور کے آغاز ہی سے یورپی اقوام اور مستشرقین نے مغلوب قوموں کے ادب پہ ہاتھ صاف کرنا شروع کیے اور یہ طریقہ واردات ہنوز جاری ہے جس کہ ہم آج بھی "تیسری دنیا" کو ادب کہتے ہیں۔ اور یہ "تیسری دنیا کا ادب" کی اصطلاح بھی در اصل نو آبادیاتی ذہنیت کے تسلسل کی ہی سوچ کی عکّاس ہے۔ چوں کہ مقامی زبانوں میں تخلیق ہونے والا سارا ادب ہی نو آباد کاروں یا استعمار کاروں کی اپنی زبان میں منتقل نہیں ہوتا بل کہ نظریاتی مفکرین، محققین یا مترجمین کی رسائی ادب کے جس حصہ تک ہوئی تھی اسی حصہ کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے "تیسری دنیا" کے ادب کی اصطلاح انہی مستشرقین اور مترجمین نے متعارف کروائی اور اسی اصطلاح کے سبب "تیسری دنیا" کے ادب کے اصول قائم کیے گئے اور ان کا اصولوں کا اطلاق

"تیسری دنیا" کے سارے ادب پر کر دیا گیا اور یہی ادب اب مغلوب قوم کی شناخت بن گیا ہے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر قاسم یعقوب کا یہ بیان انتہائی قابلِ غور ہے وہ لکھتے ہیں:

"کسی قوم یا خطے کی زبان اس کے بولنے والوں کو ایک شناخت عطا کرتی ہے۔ ان کے درمیان حریت کے پیغام کا باعث بنتی ہے۔ اردو زبان اس حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ برصغیر میں انگریزی اقتدار کے قائم ہوتے ہی، جس زبان نے سب سے زیادہ سامراج مخالف کردار ادا کیا، وہ اردو تھی۔ انگریزوں کی حکومت قائم ہوتے ہی اردو ہی وہ واحد زبان تھی، جو قائم و دائم تھی۔" (۴)

درج بالا بیان اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ "تیسری دنیا کا ادب" استعماریت کی اپنی سوچ ہے جو دراصل خود کی حاکمیت کو برتر ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ تاریخ کا مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ سال ۱۹۶۰ء کے بعد خطہ ارض کے باسیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱. سرمایہ دار
۲. اشتراکی
۳. غیر جانبدار یا سابقہ نو آبادیاں

دنیا کی یہی تقسیم، سابق نو آبادیاتی نظام اور نو آبادیوں میں موجود باشندوں کی اپنے آقاؤں کے ممالک میں موجودگی اور آقاؤں کی زبان میں تخلیقی کاوش کے عمل کو آج "تیسری دنیا کا ادب" کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادب اپنے اندرون میں وہی اختلاف اور دوغلا پن رکھتا ہے جو "ہومی کے بھابھا" کے فکری نظریات کے فروغ کا عکاس ہے۔ یہ بات اصولی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ کسی بھی قوم، معاشرہ، سماج اور مذہبی اقدار کو ہر دور میں تقسیم کیا جاتا رہا ہے خواہ وہ پُرتگالی ہو، فرانسیسی، یا انگریزی، مگر وہ سوچ جس نے برطانوی سامراج کے عہد میں تعصّب جیسی بیماری کو جنم دیا وہ صرف سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ پس نو آبادیات کی فکر میں یہ سوچ بھی کارفرما ہوتی ہے کہ مختلف سابقہ نو آبادیوں میں نو آبادیات کی مشترکہ تجربے کے باوجود کہیں بھی آفاقیت نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان نو آبادیوں میں نو آبادکاروں اور مقامی باشندوں کے درمیان ثقافتی، معاشرتی، معاشی، نفسیاتی، تعلیمی، مذہبی، اور فکری اختلافات کے سبب معاشرے میں اپنی اپنی الگ شناخت قائم ہو جاتی ہے اور نو آبادیوں میں شناخت صرف

اور صرف نو آباد کار کو ملتی ہے، محکوم اور مغلوب لوگ تو اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں اور وہ معدوم ابنِ معدوم کہلاتے ہیں۔ اسی فرق کو مقامی لوگوں کے ذہنوں میں پختہ کرنا ہی سامراجی ادبی تنقید کی خصوصیت رہی ہے۔

اردو تنقید میں پس نو آبادیاتی مطالعہ

پس نو آبادیاتی تنقید بیسویں صدی کے آخر میں اپنی فکری بنیادوں کی جڑیں مضبوط کر چکی تھی۔ مغرب میں یہ تنقید مختلف مباحث کے ذریعے کئی صورتوں میں سامنے آچکی تھیں۔ علمی سطح پر بھی پس نو آبادیاتی تنقید کی سوچ پروان چڑھتی نظر آتی ہے۔ یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی پس نو آبادیاتی تنقید مشرق و مغرب میں ایک مسلّمہ حیثیت اختیار کر چکی تھی یہ الگ بات ہے کہ اردو زبان وادب کے حوالے تنقیدی شعور کا ادراک بہت دیر سے ہوا۔ اگر کہیں شناسائی ملتی بھی ہے تو محض تعارفی نوعیت ہی نظر آتی ہے۔ اردو میں اس حوالہ سے سنجیدہ تحریروں کا باقاعدہ آغاز ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے ساتھ ساتھ دیگر جن نقادوں کا کام سامنے آتا ہے ان میں ایک نام ڈاکٹر احمد سہیل کا بھی ہے جن کے مضامین میں نظریہ پس نو آبادیت یا مابعد جدیدیت کی جھلک ۱۹۹۸ء کے آس پاس نظر آتی ہے۔ ان کے اس مضمون میں نو آبادیات، پس نو آبادیات اور ردّ نو آبادیات کے حوالہ سے تعارفی بحث ملتی ہے۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے البرٹ کامیو، برٹرینڈ رسل، ٹی ایس ایلیٹ اور سارتر کے نظریات کو بطور حوالہ پیش کر کے سامراجی نظام اور اس کے مزاج کی نشان دہی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پس نو آبادیاتی تنقید دراصل اسی سامراج اور نو آبادیات کے مزاج سے آگاہی ہی کا نام ہے۔ پس نو آبادیاتی نظریہ در اصل رد ہے اس صورتِ حال کا جس سے سابقہ نو آبادیاں دوچار تھیں۔ اردو میں "ترقی پسند تحریک" کو بظاہر سامراجی اور استعماراتی نظام کے رد کا نقطہ آغاز تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جب ۱۹۵۰ء کی دہائی میں سرمایہ دارانہ نظام کے پسِ پردہ سامراجیت اور استعماریت کا آغاز ہوا تو مزاحمت اور احتجاج کے طور ادب میں ردِّ نو آبادیت اور ردّ استعماریت کی سوچ نے جنم لینا شروع کیا جسے ہم پس نو آبادیاتی تنقید کا نقطہ آغاز خیال کرتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے پروردہ استحصالی نظام کے خلاف مزاحمت اور ردِ عمل کا جو بھی ادب ان شعراکے ہاں ہے چاہے وہ اپنی زباں میں ہے یا تراجم کی صورت میں، پس نو آبادیاتی اثرات کو واضح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ابھی تک دنیا اسی نظام کے تابع زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے تسلط کے ناقدین میں جن محققین اور نقادوں نے اپنی اپنی تصانیف دنیا کے سامنے پیش کیں اور نو آبادیاتی نظام اور اس کے موجودہ دور تک کے اثرات کا اظہار کیا ان میں سموئیل ہنٹنگٹن پی، فرانز فینن، ایڈورڈ سعید، ہومی کے بھابھا، شمیم

حنفی اور ڈاکٹر ناصر عباس نیّر وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناقدین نے اپنی تنقید کے سبب نو آبادیاتی نظام خاص یورپی سامراجی نظام کا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس نظام کے تحت تخلیق پانے والے ادب اور شناختی بحران کو بھی ایک الگ انداز میں سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی کہ اردو زبان و ادب 'جو اسی نو آبادیاتی نظام کا ساختشانہ ہے' پر اس نظام کے اثرات کو سمجھا جائے اور تحقیقی و تنقیدی سانچے سے گزار کر حقیقت کا ادراک کیا جائے تاکہ شناخت اور شناختی بحران کا ازالہ ہو سکے اور انسانیت اپنی شناخت قائم کر کے اس استحصالی نظام سے چھٹکارا پا سکے۔ اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم کردار ادب کا ہے اور ادب میں شاعری خاص نظم ہمیشہ نمایاں رہے ہیں اور ہوں گے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر ناہید قمر کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> "اردو کی فکری روایت کے ارتقا میں غلطی یہ ہوئی کہ اپنے اختیار کردہ رجحانات کو اجتماعی زندگی کے اصل پس منظر سے علاوہ کر کے دیکھا گیا۔ ہماری ادبی روایت میں علی گڑھ سے تاحال ایک پورا سلسلہ ہے۔ ادھورے نامانوس تجربوں کو اپنی ذہنی اور معاشرتی زندگی میں سوچے سمجھے بغیر جذب کرنے کا، سو ضرورت اپنی تاریخ کو از سر نو پڑھنے کی ہے اور اپنے ثقافتی حافظے اور تہذیبی نسیان کے مضمرات پر غور کرنے کی بھی ماضی نئی شناخت میں مزاحم نہیں ہوا اور اپنے اجتماعی حافظے سے محرومی کسی بھی ثقافت کی بنیادوں کو استوار نہیں رہنے دیتی۔"(۵)

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ناہید قمر نے کسی حد تک اردو زبان و ادب میں نظریہ پس نو آبادیت سے آگاہ کرنے کی ایک کوشش ضرور ہے۔

ابو الکلام قاسمی بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے اختتام پر جو ادبی اور علمی حلقے اپنے تئیں نو آبادیاتی فکر کو پیش کر رہے تھے، ان کا تجزیہ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ناقدانہ رائے کے سبب اس دور کے بنیادی کرداروں جن میں سر سیّد احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی شامل ہیں، کی مغلوب سوچ کو پرکھنے اور اس سوچ کی کھوج لگانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انیسویں صدی کے خاتمہ پر اردو کی شعری اور ادبی روایت جو صدیوں کے اخذ و قبول کی روایت ہے اور اس روایت کے ادبی معیار کی بنیاد بھی اسی سماج اور معاشرہ کی مرہونِ منت ہے اور اس روایت کی جڑوں میں مشرقی مگر مغلوب انسان کے ارتقا کے مراحل شامل

ہیں۔ اس روایت کو بالکلیہ چھوڑ کر جب محمد حسین آزاد نے نئے پیمانوں اور نئی قدروں کے مطابق اردو نظم کو پرکھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ راتوں رات ادبی تنقید کے معیارات کیسے بدل گئے اور مشرقی معیارات کو کیسے مغرب کے تابع کر دیا گیا؟ یہی حال ہمیں "مقدمہ شعر و شاعری" از الطاف حسین حالی میں بھی نظر آتا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ تاریخ کے کس دور میں یہ انہونی ہوئی ہے اور کیا محرکات تھے؟ جن کے سبب ایسا بھونچال آیا جس نے ادبی دنیا اور ادبی فکر میں کئی ایک خلا پیدا ہو گئے۔ الطاف حسین حالی کی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" میں موجود فکری و تنقیدی نظریات کو مغربی تنقید کی غلامی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس کتاب میں ادبی و شعری معیار کو ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت مغرب کے تابع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ نو آبادکاروں نے سب سے پہلے جس سرمائے کو بے وقعت بنانے اور اس کے سبب ذہنی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی وہ یہی ادبی سرمایہ تھا۔ اس غلبے کی عملی کوشش کی صلہ میں اس وقت کے نابغوں نے مشرق کے شعری و ادبی سرمائے اور اس کی روایت کو یکسر نظر انداز کر کے نو آبادیاتی نظام اور اس کی فکر کو عام کیا اور نو آبادیاتی ایجنڈے کی تکمیل میں ہر ممکن مدد فراہم کی ۔ابوالکلام قاسمی نے بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کے ادبی مزاج اور اس کی فکر میں مزاحمت کا بیانیہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالہ سے وہ بیان کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی یلغار اور مغرب کی ثقافت کے بیانیے کے مقابلہ میں ہندوستان کے لوگوں نے اپنے اندر احساسِ کمتری کو پیدا کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی فکر کے دائرے سے باہر نکل کر علمی و ادبی تخلیقات کا خصوصی طور پر ہندوستان کے علمی و ادبی اور فکری رجحانات کا غیر جانبداری سے جائزہ لینا خاصہ مشکل کام ہے لیکن اُس دور میں بھی ایسے لوگ ضرور موجود تھے جو اپنے دور کی علمی و ادبی، فکری و فنی، سیاسی و تعلیمی، تہذیبی و ثقافتی، نفسیاتی و اقتصادی اور معاشرتی فضا سے خود کو بالاتر رکھ کر سچائی تلاش کرنے کی بھرپور سعی کی۔ ان لوگوں میں اکبر الہ آبادی اور ڈاکٹر علّامہ محمد اقبال کا نام سرِفہرست ہے۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری خصوصاً نظم میں اگرچہ طنز و مزاح کا عنصر شامل ہے لیکن ان کا یہ سارا طنز دراصل اس نظام پر گہری چوٹ اور مزاحمت ہے جو وہ اس نظام کا حصہ ہوتے ہوئے بھی محسوس کر رہے تھے اور اپنے درد کو عوام کے قلوب و اذہان میں پیوست کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ اقبالؒ بھی ایسی ہی شخصیت کے حامل ہیں جو مغرب کی مصنوعی صنعتی و سائنسی ترقی اور عقل پرستی کا کھوج لگا چکے تھے اور مشرق کی مابعد الطبیعات سے بھی مکمل واقف تھے۔ ان کی شاعری میں جابجا مغربی تہذیب کے خلاف مزاحمت صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

پس نو آبادیاتی فکر کے حاملین میں ایک نام شمس الرّحمان فاروقی کا بھی ہے جنھوں نے اردو زبان و ادب میں اس فکر کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے بقول اردو ادباء و شعراء میں خصوصی طور پر وہ اکبر الٰہ آبادی اور اقبال کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے بقول اکبر الٰہ آبادی اور ڈاکٹر علاّمہ محمد اقبال اردو ادب میں سب سے بڑے پس نو آبادیاتی ادیب کے طور پر ابھرتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کی شاعری اور فکر کا جائزہ لیتے ہوئے شمس الرّحمان فاروقی یہ واضح کرتے ہیں کہ اکبر ترقی اور روشن خیالی کے بالکل مخالف نہ تھے بل کہ اس سامراجی اور استعماراتی غلبے اور فکر کے مخالف تھے جس کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے نو آباد کاروں نے ترقی اور تہذیب و ثقافت کے ستونوں کو بطور سہارا استعمال کیا ہے۔ اکبر کی شاعری میں پس نو آبادیاتی فکر کے کئی پہلو مل جاتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے سبب ہندوستان اور اردو زبان جس تہذیبی بحران کا شکار تھی اکبر اس بحران سے بخوبی واقف تھے۔ اکبر کی شاعری میں مستعمل علامات پانی کا نل، ریل گاڑی، ٹیلی فون، اور اخبار وغیرہ کو استعماری فکر کی مذمت اور مزاحمت کے طور پر طنز سے گزارا گیا ہے۔ فاروقی صاحب کے بقول اس مذمت کے پیچھے ترقی کی مخالفت کی سوچ ہرگز نہیں تھی بل کہ اس ترقی کے ساتھ آنے والی نو آبادیاتی اور استعماراتی غلامی اور سوچ و فکر کی مذمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر نے نو آبادیاتی دور کو مستحکم و مضبوط کرنے والے تعلیمی نظام کی مخالفت ضرور کی لیکن تعلیم کی نہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں اگرچہ نو آبادیاتی دور کا خاتمہ ضرور ہو گیا مگر اس کے اثرات مختلف شکلوں میں نو آبادیاتی و سامراجی اور استعماراتی سوچ کی توسیع کے تجربات کی صورت میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں جسے آج تیسری دنیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شمس الرّحمان فاروقی کا کہنا ہے کہ:

> "اکبر وہ پہلے شخص تھے جنھیں نو آبادیاتی فکر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا ادراک تھا اور انھوں اپنی شاعری میں اس کو خوب ذکر بھی کیا ہے"۔ (۶)

اردو زبان و ادب میں نظریہ پس نو آبادیات کی تنقیدی فکر کے حوالہ سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی ناقدانہ رائے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی سے شروع ہونے والی مابعد جدیدیت، سامراج اور استعماراتی سوچ کے مخالف قائم ہونے والے بیانیہ خصوصاً نظریہ پس نو آبادیت کے حوالہ سے تنقیدی تھیوریز کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اُن کے جائزہ جات کے ضمن میں اردو زبان و ادب کو خوب پرکھنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔ نو آبادیاتی صورتِ حال، اردو زبان و ادب میں نو آبادیاتی و سامراجی اور استعماراتی سوچ و فکر اور اردو کے ادباء و شعراء کے ہاں پس نو آبادیاتی تصورات ان کے مطالعہ کا حصہ ہیں۔ ان کے مطابق نو آباد کار، نو آبادیاتی دنیا کو دو میں

تقسیم ہی نہیں کرتا، نو آبادیاتی باشندوں کی دنیا کو تشکیل بھی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نو آبادیاتی باشندوں کی دنیا ان کی اپنی دنیا نہیں ہوتی، انھیں اپنی دنیا پر کوئی تصرف اور اختیار نہیں ہوتا، نہ اس دنیا کے حقیقی، عملی معاملات پر اور نہ اس دنیا کے تصور اور اس کے نظام اقدار پر۔ وہ اپنی ہی دنیا میں اجنبی، اور اس کے باہر ہوتے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ نو آبادیاتی باشندے کو آبادکار جو تصورات دیتا ہے وہ اسے بالعموم قبول کرتا اور اس کے مطابق جینا شروع کر دیتا ہے اور نو آبادیاتی دنیا میں جو کردار اسے ادا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، وہ اسے عموماً تسلیم کر لیتا ہے۔ فرانز فینن، البرٹ، میمی اور ایڈورڈ سعید تینوں اس امر پر متفق ہیں کہ نو آبادیاتی اقوام، نو آبادکار کے دیے گئے تصور، ذات اور کردار کو تسلیم کر لیتی ہیں اور اس کی وجہ سے نو آبادیاتی نظام قائم رہتا ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں کہ نو آبادیاتی نظام کی بر قراری میں خود مقامی باشندوں کا انفعالی کردار معاونت کرتا ہے۔ نو آبادیاتی باشندوں کو ایک ایسا تصورِ ذات دیا جاتا ہے، جو نو آبادیاتی نظام کے قیام و استحکام میں مدد کرتا ہے۔ مزید براں ہندوستان کے لوگوں کی فطرت میں موجود توہم پرستی، ان کے رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کے مظاہر کو اپنے اعلیٰ اقدار اور معیاراتِ تنقید اور تصورِ کائنات یعنی یورپی تصورِ کائنات کے لحاظ سے پرکھا ہے جس کے سبب ان نو آبادکاروں خود کو ہمیشہ اعلیٰ اور برتر شمار کیا ہے۔ ان نو آبادکاروں نے اپنے اس زعم میں ہندوستانیوں کو سخت کاہل، سست، وحشی اور تہذیب سے عاری قرار دے کر اپنی تہذیب، زبان، ثقافت اور رسم و رواج کو زندگی کا حصہ بنانے پر زور دیا ہے جس کا مظاہرہ سر سیّد کی تحریک جدید، ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے کرداروں اور الطاف حسین حالی کے نظریہ تنقید اور محمد حسین آزاد کے تنقیدی نظریات کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے مقامی تہذیب و ثقافت کے علم کو ایسی تخلیق قرار دیا ہے جس میں نہ صرف نو آبادکار بلکہ مستشرقین بھی برابر کے شریک رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق نو آبادکاروں اور مستشرقین کا حاصل کردہ یہ ثقافتی علم حقیقت پر مبنی نہیں ہے اور نہ ہی اس علم سے حاصل ہونے والی معلومات حقیقی سیاق وسباق کو پیش کرتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کی تخلیق میں عمومیت کا اصول کارفرما رہتا ہے۔ مزید یہ کہ نو آبادکار اور سامراج و استعمار کار اس مقامی ثقافت کے علم کو محض اپنے غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "آزاد ذہن نو آبادکار کی ثقافت کا براہ راست علم حاصل کرتے ہیں، مگر اپنی ثقافت سے بے گانگی کی قیمت پر نہیں، دونوں ثقافتوں سے راست اور گہرا ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے وہ حقیقی آفاقی نقطہ نظر اختیار کرنے کی اہلیت حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی ثقافت کے

سلسلے میں ماضی پرستی اور تعصب کا شکار ہوتے ہیں نہ نو آبادکار کی ثقافت سے مرعوب ہوتے ہیں، ان کی ذہن رشتہ ثقافتوں کے فکری و عملی اور تخلیقی حاصلات سے قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں کی خوبیوں کے مداح اور دونوں کی کمزوریوں کے نکتہ چیں ہوتے ہیں، اور خوبیوں اور کمزوریوں کا تصور، وہ کسی ایک ثقافت سے نہیں، مجموعی انسانی ثقافت اور اے پس ٹیم سے اخذ کرتے ہیں۔ نو آبادکار اپنی نو آبادیاتی ذہنیت کے مظاہرے کے لیے سیاسی و سماجی، معاشی، تعلیمی شعبوں کو منتخب کرتا ہے، ان میں اپنی آئیڈیالوجی کا بیج بوتا ہے۔ آفاقی نقطہ نظر ان شعبوں کے بجائے، مستقل اہمیت کے فکری و علمی منطقوں سے خود کو منسلک کرتا ہے۔ یہی منطقے کسی عہد کی اے پس ٹیم تشکیل دیتے ہیں۔ یہ نو آبادیاتی صورت حال سے فرار اور ذہنی خانقاہوں میں پناہ گزین ہونے کا عمل نہیں ہے، بلکہ نو آبادیاتی آئیڈیالوجی کا تابع مہمل بننے سے انکار اور حقیقی انسانی علم کی روایت سے وابستہ ہونے کا آزادانہ ذہنی عمل ہے۔"(۷)

درج بالا بیان یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نو آبادکار اور سامراج و استعمارِ کار نے ہمیشہ ہی مقامی باشندوں کی تہذیب و ثقافت کے علم کو اپنے غلبہ کے لیے بطور مددگار کے استعمال کیا اور اسی علم کے نتائج کو جب مزاحمتی انداز میں پرکھا گیا اور مزاحمتی نظریات قائم کیے گئے تو اس مزاحمتی علم و نظریات کا نام پس نو آبادیات کا نام دیا گیا۔

حوالہ جات

۱۔　ناہید قمر، ڈاکٹر "اردو ادب میں تاریخیت" اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۷ء، ص۷۷ تا۷۸

۲　نیر، ڈاکٹر، ناصر عباس، "نو آبادیاتی صورتِ حال" مشمولہ اخبارِ اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد ۲۶، شمارہ:۴، اپریل ۲۰۰۹ء، ص۱۷

۳۔　ایضاً، ص۱۹

۴۔　قاسم یعقوب، ڈاکٹر، "اردو زبان: تشکیل و ارتقا"، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۱۹ء، ص۱۶۸ تا۱۶۹

۵۔　ناہید قمر، ڈاکٹر "اردو ادب میں تاریخیت" اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۷ء، ص ۸۳

۶　شمس الرّحمان، فاروقی، "صورت و معنیِ سخن"، کراچی، آکسفورڈ پریس، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۴

۷۔　نیر، ڈاکٹر، ناصر عباس، "نو آبادیاتی صورتِ حال" مشمولہ اخبارِ اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد ۲۶، شمارہ:۴، اپریل ۲۰۰۹ء، ص۲۱